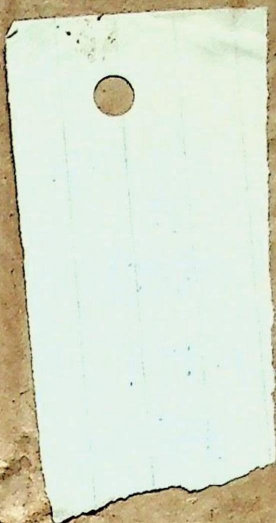
Hindu Muslim Ikhad ki Khani
By S. S. Nand C.E.V.







1569







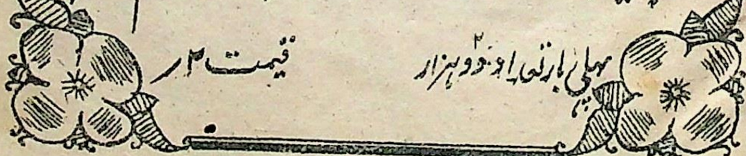
اوم

ہندو مسلم اتحاد کی کہانی



پوجیہ پاد شری سوامی شردھانند جی مہاراج

تیج پریس دہلی میں لالہ دیش بندھو گپتا کے اہتمام سے چھپی



پہلی بار تعداد دو ہزار

قیمت ۲ ر

خواجہ حسن نظامی کا تبلیغی پروپگنڈا

اور

اُس کی روک تھام

خواجہ حسن نظامی کا رسالہ داعی اسلام خوب مشتہر ہو چکا ہے، اُس کے ترمیم شدہ ایڈیشن کا ہندی ترجمہ بھی ہزاروں کی تعداد میں ہندو پبلک تک پہنچ چکا ہے، میں نے اس کے غیر ترمیم شدہ اصل اُردو ایڈیشن کو بجنسہٖ بطور ضمیمہ دیکر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو خبردار کرنے کے لئے اپنی طرف سے اُسکی مختصر پڑتال کردی ہے اور ساتھ ہی فرنگی محل لکھنؤ کے مولانا عبدالباری کے (مسلمانوں کے نام) اُس کے کھلے خط کی کیفیت بھی درج کردی ہے، جو مولانا موصوف نے مسلمانوں کے لئے اُن کا فرض جتلانے کے لئے لکھا تھا۔ اس رسالہ کا نام رکھا ہے۔

ہندو و خبردار

تمہارے دھرم درگ پر شبخون بولا گیا ہے

باوجود ضخامت بڑھ جانے کے قیمت صرف چار آنہ رکھی گئی ہے اور محصولڈاک اس کے علاوہ ہے، جو اصحاب یک صد یا اس سے زیادہ جلدیں منگائیں گے اُن کے لئے قیمت فی جلد تین آنہ اور محصولڈاک معاف ہوگا۔ رسالہ کی قیمت اس لئے رکھی گئی ہے کہ اگر بک جاوے تو اس کا دوسرا ایڈیشن اور نیز اسی طرح کے ضروری رسالے شائع کئے جاویں، دولتمند ہندو اگر انھیں خرید کر مفت تقسیم کرینگے تو اسکی زیادہ ہوگی۔

شردھانند سنیاسی

مندرجہ بالا کتاب کی کاپیاں ہمارے مندرجہ ذیل ایجنٹوں سے بھی مل سکتی ہیں۔

(۱) ہرگلال موہنچند عرضی نویس پانی پت (۲) این ڈی سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہوری دروازہ لاہور۔ (۳) حکم چند گپتا چوڑا بازار کرنال (۴) بھولا ناتھ رام کشن سوداگر سبزی پانی پت (۵) راجپال منیجر سرسوتی آشرم لاہور (۶) بشن سروپ مہرا ایجنٹ اخبارات ڈالم بازار میرٹھ۔

(خریداری کی درخواستیں منیجر روزانہ اخبار تیج دہلی کے نام آنی چاہئیں)

اوم
ہندو مسلم اتحاد کی کہانی

تمہید یہ بات مانی ہوئی ہے۔ کہ ہندوستان کی بادشاہت انگریزوں نے مسلمانوں سے نہیں، بلکہ ہندوؤں سے حاصل کی۔ پنجاب میں سکھوں کا راج تھا۔ دکشن میں مرہٹوں کا۔ ممالک متحدہ میں بھرت پور کے جاٹ اور دیگر ہندو فرمانروا تھے۔ مغل بادشاہ دہلی کے قلعہ میں ایک طرح سے محصور رہتے تھے۔ مسلمان حاکم اودھ اور حیدرآباد دکن وغیرہ میں خود مختار ہو چکے تھے

اسوقت تک ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات بہت اچھے ہو چکے تھے پنجاب میں رنجیت سنگھ شیر پنجاب کے دربار میں فقیر عزیز الدین صاحب کا پایہ کسی سکھ یا ہندو وزیر سے کم نہ تھا۔ دیگر جگہوں میں بھی ہندو مسلمان ملکر رہنے لگ گئے تھے۔ مذہبی تعصبات سے مسلمان زیادہ تر بری ہو چکے تھے۔ جہاں کہیں انگریزوں نے ہندوستانی فرمانرواؤں سے ممالک حاصل کئے۔ وہاں ہی ہندو مسلمانوں نے نہ صرف پہلو بہ پہلو انکا مقابلہ کیا بلکہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر شریک رہے ہیں۔ تمام میں بھی

تعلقات بہت ہی نزدیک تھے۔ یہ حالت انگریزوں کی ملک گیری
کے بعد بھی قائم رہی۔ فرق صرف اتنا ہوا۔ کہ جہاں ہندوؤں نے
عیسائی فرنگیوں کے یہاں ادنے نوکری صرف چپڑاسی گیری اور
چوکیداری قبول کی۔ وہاں پہلے تو مسلمان باورچی اور خانسامے
بھی انہیں نہ ملے۔ اور انگریزوں نے بھنگی باورچی وغیرہ کاموں کے
لئے رکھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ کام مسلمان ہی کرنے لگ گئے۔
یہ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ جو ملازم کھانا کھلانے اور غسل کرانیکا وغیرہ
نزدیکی خدمت کے کام انجام دے۔ اُسے آقا کے ساتھ زیادہ نزدیکی
تعلق ہو جاتا ہے۔ مسلمان اہلکار بھی چونکہ انگریزوں سے اسقدر ہندوؤں کی
نفرت نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ چھوت چھات کی رسم کے باعث
ہندو۔ اسلئے مسلمان اہلکار انگریز افسروں طبیعتوں پر زیادہ غالب ہو
گئے۔ ہندوؤں میں یہ مشہور ہوا۔ کہ مسلمان اہلکار انگریزوں کی خوشامد
کرنیکی وجہ سے اُن کے زیادہ نزدیک ہیں۔ لیکن وجہ تو وہی تھی
جو میں نے اوپر بیان کی۔

غدر میں تبدیلی

یہ حالت تھی۔ جب سنہ ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر پھوٹ
نکلا۔ چونکہ اُس تحریک کے چلانے والے کسی باہمی
نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے پسپا ہو گئے۔ اسلئے انہیں فاتحوں کیطرف
سے باغی کا بدنام عطا ہوا۔ اگر وے کامیاب ہو جاتے۔ تو شاید تواریخ
میں اُن کا نام محبان قوم کے زمرے میں ہمیشہ کیلئے روشن رہتا۔ غدر

ہو گیا۔ اور انگریزوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ پنجاب نے اسوقت انگریزوں کی حکومت کے استحکام میں خاص مدد دی۔ میرے سورگباسی پتا کبھی ایک سو سواروں کا دستہ لیکر بحیثیت رسالدار کے آن موجود ہوئے۔ انہوں نے اُن دنوں کا ایک خاص واقعہ سنایا۔ جو اسوقت کے خیالات کا عملی مظہر ہے۔

میرے پتا کا نام نانک چند تھا۔ اُن کے رسالہ میں دوسرے ایک سو منت کے رسالدار ہوپ سنگھ تھے۔

دونوں سردار میجر ارل صاحب کے ماتحت بریلی کے نزدیک بن ایسے کے میدان میں باغیوں سے جنگ میں مشغول تھے۔ شام کا وقت تھا۔ میجر ارل ایک کیمپ میں چارپائی پر اور دونوں سردار دوسری چارپائی پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ دفعتاً میجر صاحب نے فرمایا۔ (وہ دیکھو ایک سؤری کے ساتھ اس کے بچے جا رہے ہیں)۔ سرداروں نے کوئی سؤری نہ دیکھکر کہا۔ نہیں کوئی سؤری اور اس کے بچے دکھائی نہیں دیتے۔ میجر صاحب نے انگلی کا اشارہ کر کے کہا۔ (وہ دیکھو) اصل بات یہ تھی۔ کہ ایک مسلمانی عورت کے ساتھ اس کے دو تین بچے جا رہے تھے۔ اور صاحب بہادر کو یہ شک تھا۔ کہ شاید یہ انگریزی فوج کا راز دریافت کرنے آئی ہے۔ سردار ہوپ سنگھ نے کہا۔ (آخر حضور ایسا کبھی نہ ہوگا لیکن وقت آئیگا۔ جب یہی سؤری کے بچے حضور لوگوں سے زیادہ زبردست

ہوں گے۔ اور ہم جو آپ کے لئے جان ہتھیلی پر لیکر آئے ہیں. آپ سے بہت
دور ہو جائیں گے. میجر آرل نے فرمایا "یہ کسطرح ہو سکتا ہے. کیا ہم ملاّ نوں
کی کرتوتوں کو بھول سکتے ہیں. یا آپ لوگوں کی جانثاری کو فراموش کر سکتے
ہیں. آپ لوگ ہمارے ہمیشہ دوست رہیں گے۔"
اڑھائی برس گذر گئے۔ رسالدار نانک چند بانس بریلی میں پولیس انسپکٹر ہیں
میجر ارل بریلی کے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں. اور رسالدار بھوپ سنگھ
شاید مرادآباد یا کسی دوسرے ضلع میں تحصیلدار ہیں. بریلی کے کورٹ انسپکٹر
ایک مسلمان مولویصاحب ہیں. ٹھاکر بھوپ سنگھ کسی تقریب پر بریلی آئے
اور اپنے پرانے جنگ کے ساتھی سردار نانک چند کے یہاں مقیم ہوئے
صلاح ہوئی کہ چلکر اپنے پرانے میجر صاحب سے ملیں. دونوں سردار
صاحب بہادر کے بنگلے پر پہنچے۔ بہرہ نے اطلاع کی. اور کرسیاں برآمدہ
میں بچھوا دیں۔ صاحب غسل خانہ میں تھے. سندیسا ملا. کہ غسل
خانہ سے فارغ ہو کر ملیں گے۔ پانچ منٹ پیچھے مولوی صاحب تشریف
لے آئے۔ اور چک اٹھا کر اندر چلے گئے۔ غسل خانہ سے دونوں کی بات
چیت کی آواز آنے لگی۔ سردار بھوپ سنگھ نے سردار نانک چند کو تپ لیسے
کی سوری والی بات یاد دلا کر کہا۔ کہ وہ میجر صاحب سے اس کا ضرور ذکر کرینگے
مولویصاحب بیس پچیس منٹ بات چیت کر کے چلے گئے۔ اس کے دس
منٹ بعد بہرہ آیا۔ اور صاحب کے کمرے میں دونوں کو لیگیا۔
چھٹتے ہی سردار بھوپ سنگھ نے اپنے ساتھی سردار کے اشارہ تا منع کرنے کو تو

جو دل میں آیا۔ کہہ ڈالا۔

"میجر صاحب! حضور کو ین یسے کی سوری والی بات یاد ہے؟" میجر صاحب کو کچھ یاد نہ تھا۔ سردار بھوپ سنگھ نے کہا۔ "ین یسے میں ایک شام کو حضور نے مجھے اور سردار نانک چند کو سوری اور اُس کے نیچے دکھا کر اُن سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ تب میں نے کہا تھا۔ کہ وقت آئیگا۔ جب یہی سوری کے بچے حضور لوگوں کے زیادہ تر نزدیک ہونگے۔ اور ہم جو آپ کے لئے جان ہتھیلی پر رکھکر آئے ہیں۔ آپ سے بہت دور ہو جائیں گے۔" صاحب کے چہرے پر کچھ غصہ اور شرم کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور کہا کہ آپ کا وہم ہے۔ یہ کورٹ انسپکٹر ہیں۔ بڑی راز کی بات ظاہر کرنے آئے تھے۔ آپ لوگوں سے میرا پورانا ہی تعلق ہے۔

سردار بھوپ سنگھ تو چلے گئے۔ لیکن مولویصاحب نے سردار نانک چند پہ ایک مقدمہ اُٹھوا دیا۔

میجر ارل نے بھی اُس میں اُن کی مدد کی۔ آخر کار منصف مزاج مسٹر ایڈورڈس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت سے میرے والد بزرگوار باعزت بری ہوئے۔ اور مولوی صاحب کو جو شفقت اُٹھانی پڑی۔ اور انہیں اُس کی بدولت جو نقصان پہنچا۔ اُس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ ہی ۱۸۵۷ء کے اکتوبر کی بات اور یہ ہے ۱۸۶۰ء کے پانچ واپریل کی بات اُس اڑھائی برس کے عرصہ میں اسقدر تبدیلی کسطرح واقع ہوئی۔ وہ اُس وقت ایک راز سربستہ تھا۔

تبدیلی کیسے واقع ہوئی

انگریز حاکموں کے خیالات ڈھائی برسوں میں کیسے یکلخت بدل گئے۔ یہ بات تک معمہ رہا۔ بدلنے کا حال ہندوؤں کو تو معلوم ہی نہ ہوا۔ آخر جب ۱۹۰۱ء میں مولوی الطاف حسین حالی نے حیات جاوید یعنی سرسید کی لائف لکھکر چھپوائی۔ تب یہ عقدہ حل ہوا۔ اسی کتاب کی بنا پر اصل حال جانا جا سکتا ہے۔ سرسید عرصہ تک دہلی میں منصف رہے۔ غدر سے دو سال پیشتر وہ صدر امین کے عہدہ پر ترقی پاکر بجنور کے ضلع میں تبدیل ہو گئے۔ وہ بجنور کی تاریخ لکھکر صدر بورڈ آگرہ میں بھیج چکے تھے۔ جب غدر ہو گیا۔ اسوقت انگریز حکام اور اُن کے بال بچوں کو باغیوں کے ہاتھ سے بچانے کا سرسید نے بڑا نمایاں کام کیا۔ باغیوں کا سرغنہ نواب محمود خاں تھا۔ اسے سمجھایا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئیگا۔ بہتر ہے۔ کہ اُن کو صحیح سالم یہاں سے جانے دو اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ۔ اسی طرح نشیب و فراز سمجھائے۔ کہ نواب قابو میں آگیا۔ کلکٹر صاحب سے ایک تحریر بھی اسے دے دی۔ جس پر اگر وہ عمل کرتا۔ تو اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا۔ جو اور خیر خواہوں کے ساتھ ہوا۔

انگریزوں کے رڑکی چلے جانے کے بعد نواب نے سرسید کو قابو کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے سمجھایا کہ اگر بالفرض انگریز چلے گئے۔ تو آپ نواب سیٹ بناتے ہیں۔ آپ کی نوابی کوئی نہیں چھینتا۔ اور اگر میرا خیال ٹھیک ہے۔ کہ انگریزوں کی عملداری ہرگز نہ جائیگی۔ تو آپ خیر خواہ سرکار رہیں گے۔ اور سرکار آپ کی نہایت قدر

کرے گی۔ نواب نے نہ مانا

سر سید اس فکر میں تھے۔ کہ کسی طرح بجنور سے نکلکر میرٹھ پہنچ جائیں مگر موقع نہ ملتا تھا۔ اسی عرصہ میں ہلدور کے چودہریوں نے ایک انبوہ کثیر جمع کر کے محمود خاں کی فوج پر حملہ کیا۔ اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔ سر سید نے اسکی مکمل رپورٹ کمشنر کو لکھ بھیجی۔ وہاں سے حکم آگیا۔ کہ تم سرکار کیطرف سے ضلع کا انتظام کرو۔ اور ڈپٹی احمد خاں اور میر تراب علی کو اپنے ساتھ شریک کر لیا

نواب محمود خاں نے پھر ایک جماعت اکٹھی کر لی۔ اور چودہریوں کو شکست دی۔ وہ بھاگ گئے۔ تب ہلدور پر بھی نواب نے حملہ کر کے چودہریوں کو شکست دی اور ان کے بہت سے مکانات جلا دیئے۔ تب بہزار دقت سر سید میرٹھ پہونچے۔ اور کچھ کم پانچ ماہ وہاں رہے۔

بجنور میں نواب سے شکست کھا کر کچھ ہندو رئیس میرٹھ چلے آئے تھے۔ اور کچھ نواب نے قید کر لئے تھے۔ ہندو رئیس اپنے آپ کو سرکار انگریزی کا بڑا خیر خواہ ظاہر کرتے تھے۔ لیکن سر سید نے غدر کے ختم ہوتے ہی ان کی نسبت ایک عجیب خیال ظاہر کر کے حکام انگریزی کے خیالات بدل دیئے۔ حالی صاحب لکھتے ہیں۔ ہندو رئیس جنہوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی۔ اور جو اپنی باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیر خواہی کے لباس میں ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ کہ جو لوگ مسلمانوں کے ان حملوں میں شریک تھے۔ جو انہوں نے ...... ہندو رئیسوں پر کئے۔ وہ سب باغی

قرار دیئے جائیں۔ اگر اسوقت یہ فیصلہ ہو جاتا۔ تو ضلع بجنور خاک سیاہ
اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔ سر سید نے مسٹر شکسپیئر اور بعض افسران
فوج سے اسبات میں گفتگو کی۔ اور کہا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف
وہی لوگ قرار پانے چاہئیں۔ جو اب سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں
باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کئے۔ قانون
کی رو سے ان کی نسبت جو کچھ تجویز ہو۔ سو ہو۔ مگر ان کی وجہ سے کسی کو سرکار
کے مقابلہ میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بروقت داخل
ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے۔ اور سب لوگ معہ نواب
محمود خاں کے حاضر ہو جائیں۔ تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار
دینا نہیں چاہیئے کہ اس پر بہت بحث ہوئی۔ اور آخر یہ بات قرار پا
گئی۔ کہ جو لوگ سرکاری فوج کے مقابلہ میں آئیں۔ وہی باغی قرار دیئے
جائیں۔" لیکن بد نصیبی سے آم سوت۔ نجیب آباد۔ اور نگینے پر احمد اللہ خاں
اور ماڑے خاں وغیرہ نے خفیف خفیف مقابلے کر کے ہزاروں کو لڑائی
میں قتل کرا دیا۔ اور تمام ضلع کیطرف سے سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا۔
(دیکھو حیات جاوید صفحہ ۷۷)

مسلمانوں کی خاص چالاکی

اوپر کے لمبے چوڑے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بجنور کے ہندو رؤساء
کی سرکاری خیر خواہی کو تو سر سید نے خاک میں ملا دیا۔ اور مسلمان باغیوں
کو ان کے سرغنہ نواب محمود خاں سمیت بچانے کے لئے کوشش میں کامیابی

حاصل کی۔ مگر پھر بھی مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔ اور پسپا ہوئے۔ جس کے سر سید ذمہ وار نہیں ہیں۔

مولانا نذیر احمد نے سر سید کی حُبِ قوم کے بارے میں لکھا تھا "سر سید احمد خاں کو حسن خدمات غدر کے صلہ میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس رہبر صادق علی ور ستم علی رئیس چاند پور) باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا۔ مگر سر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اس کے لینے سے انکار کیا۔ کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی ان کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی" سر سید کی اپنی قوم کے ساتھ محبت کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ لیکن مقابلہ میں افسوس کے دیکھا جاتا ہے۔ کہ ہندوؤں کے بیسیوں خیر خواہان سرکار نے محض اپنی شکم پوری اور خود غرضی کے پورا کرنیکا ذریعہ سرکار کی مہربانی کو بنایا اور اپنے ہم مذہبوں کو اس سے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچایا۔ سر سید نے جو کچھ بھی کیا اس میں انکی اپنی خود غرضی کا کوئی حصہ نہ تھا اور یہ بے الضافی انکی ہندو رؤسا کی نسبت عمل میں آئی وہ بھی اپنے مسلمان بھائی کو بچا نیکے لیے تھی

اپریل ۱۸۵۸ء میں سر سید مراد آباد کے عہدہ صدر الصدور ی پر ترقی پاکر چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے اپنی قوم کی بیش بہا خدمت کی۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں جبکہ باغیوں کی جائداد منضبط کے متعلق غدر داریاں ہونے لگیں۔ اور ان کی سماعت اور تحقیقات کے لئے ایک سپیشل کمیشن بیٹھا۔ اس میں دو یورپین ممبر ایک کمیشن بیٹھا۔ اس میں دو یورپین ممبر ایک۔ کمشنر روہیلکھنڈ دوسرے جج مراد آباد اور

اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سر سید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے تھا
(دیکھو صفحہ ۴۸)

"مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا گیا ہے۔ کہ سر سید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غدر داریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی۔ اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ جائدادیں جسقدر ضلع مراد آباد میں واگذاشت ہوئیں۔ ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔ ایک بہت بڑا فائدہ سر سید کے مراد آباد ہونے سے خاص کر مسلمانوں کو یہ پہونچا۔ کہ مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد جو رو ہیلکھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور عالم محدث تھے۔ انہوں نے چند یورپین عورتیں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لئے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا۔ مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی۔ اور انہوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر ان سب کو قتل کر ڈالا۔ مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثہ عظیم ان کے مکان میں گذرا تھا۔ اور ان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار ان مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا۔ سرکاری تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے۔ اور حکام ضلع کو ان کی تلاش درپیش تھی۔ اور ان کی نسبت یہ گمان تھا۔ کہ باغیوں کے ساتھ ان کی ضرور سازش تھی۔ ورنہ ان کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے۔ مگر سر سید کو معلوم ہو گیا تھا۔ کہ مولوی عالم علی معقول وجوہ

اور انہوں نے نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے۔ کہ باغیوں کو مولوی صاحب کوئی وجہ عداوت نہ تھی۔ کہ وہ ان کو یا ان کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے۔ سر سید نے مولوی صاحب کی ہمیت کے لئے صاحب ضلع سے باوجودیکہ وہ نہایت برافروختہ تھا۔ بڑی دلیری کے ساتھ گفتگو کی۔ اور کہا کہ میں مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں۔ لیکن جب تک کہ آپ یہ وعدہ نہ کریں۔ کہ ان سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا۔ اسوقت تک میں ان کے بلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ آخر صاحب ضلع نے ان سے یہ وعدہ کر لیا۔ کہ ہم ضابطہ کی تحقیقات تو ضرور کرینگے۔ لیکن چونکہ تمہارے نزدیک وہ بے قصور ہیں بعد ضابطہ کی کارروائی کے ان کو بری کر دیا جاوے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ سر سید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا۔ اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیئے گئے۔ (صفحات ۸۲ و ۸۳)

مراد آباد میں سر سید نے تاریخ سرکشی بجنور لکھی جس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی ظاہر کیا۔ کہ ہندو چودھریوں نے مسلمانوں پر بہت تشدد اور سختیاں کی تھیں۔

رسالہ اسباب غدر اور ہندوؤں کی قسمت کا فیصلہ

مراد آباد میں ہی انہوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان مرتب کیا۔ اس کی محرک وجہ کو مولانا حالی اس طرح پر بیان

کرتے ہیں۔

"وہ (یعنی سرسید) بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھکر آئے تھے۔ جب مراد آباد میں پہونچے۔ تو اُن کی تباہی اور بربادی کا اور بہی بادہ عبرت انگیز نقشہ اُن کی نظر سے گذرا۔ جس سے ایک اور چوٹ اُن کے دل پر لگی۔ گورنمنٹ کا غصہ خاصکر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندوستانی (مراد ہندوؤں سے ہے) خیرخواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے بدلے رہے تھے۔ اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لئے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ انکا مسلمان ہونا ہی انکے مجرم ٹھہرانے کے لئے کافی تھا" اس کے بعد اس امر کا ذکر کرکے کہ سرسید کے مراد آباد جانے سے وہاں کے مسلمانوں کو فایدہ پہونچا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں "مگر سرسید اس پر قانع نہ تھے۔ بلکہ وہ اس فکر میں تھے۔ کہ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک عام بدگمانی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کیطرف سے پیدا ہوگئی ہے۔ وہ کسی طرح رفع کیجاوے ..... گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنے مخالف خیال کر لیا تھا ...... ملک کی حکومت انہوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اور انہیں وہ اپنا حریف اور سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے۔ اور بدقسمتی سے بقول سرسید کے بھس بھری ہوئی مردہ کھال دلی میں موجود تھی مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی۔ اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کے شکار ہو جائیں۔"

(صفحات ۸۷ و ۸۸)

اِس بنا پر اُنہوں نے مراد آباد میں آ کر اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا اِس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اِس کے کہ اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرائیں۔ اُردو میں ہی اُس کو مطبع مفصلیگزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیجدیا اور ۱۸۵۹ء میں اُس کی پانچ سو جلدیں چھپ کر اُن کے پاس پہونچ گئیں۔ (صفحہ ۵۹)

اِس رسالہ نے کیا کارنمایاں کیا؟

جب رسالہ اسباب بغاوت کی پانچصد جلدیں سرسید کے پاس آگئیں۔ تو سرسید نے اول دو رکعتیں بطور شغل کے ادا کیں۔ اور دعا مانگی۔ اور اُسی وقت دو کم پانچصد جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیجدی۔ اور ایک جلد اپنے پاس رکھہ لی۔ (صفحہ ۸۹) کتاب کا گورنمنٹ ہند میں ترجمہ ہوا۔ تو گورنر جنرل نے کتاب خیر خواہی سے لکھی گئی سمجھی۔ لیکن مسٹر سیسل بیڈن فارن سکرٹری نے مضمون باغیانہ بتلایا۔ پھر جب سرسید سے وہ ملے۔ تو شکایت کی کہ اگر سرکار کی خیر خواہی سے تم کتاب لکھتے۔ تو اُس کی سارے ہندوستان میں اشاعت نہ کرتے۔ سرسید نے انہیں ۴۹۸ جلدوں کی رسید دکھائی۔ اور باقی دو کا پتہ دیا۔ اور کہا کہ اگر اسکے سوا ایک بھی جلد کہیں ہندوستان میں ملجائے۔ تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دونگا۔ (صفحہ ۹۰) تب مسٹر سیسل بیڈن سرسید کے دوست حامی اور مددگار ہوگئے۔

اِس کے ولایت میں کئی ترجمے ہوئے مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شایع نہ کیا گیا۔ جب یہ رسالہ شایع ہی نہ کیا گیا۔ تو ہندوؤں کو اِس کے وجود سے خبر کیسے

ہو سکتی تھی! مولانا حالی صاحب لکھتے ہیں۔ "چونکہ یہ رسالہ عام طور پر
شائع نہیں ہوا۔ اور نہ امید ہے۔ کہ آئندہ شائع ہو۔ اس لئے ہم نے اس کے
مضامین کا خلاصہ بطور ضمیمہ کے کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا ہے۔"

دلائل بحق مسلمانان

میں نے اس ضمیمہ کو پڑھا۔ شروع میں ثابت
کیا ہے۔ کہ بغاوت کا باعث (۱) روس و
ایران کی سازش کچھ نہ تھی۔ (۲) شہزادہ ایران کے خیمہ میں جو اشتہار نکلا۔ وہ
بھی نہ تھا۔ (۳) دہلی کے معزول بادشاہ کا ایران کو فرمان لکھنا۔ عجیب نہیں
کیونکہ وہ مالیخولیا والا آدمی تھا۔ لیکن وہ بنیاد سرکشی نہ تھی۔ (۴) اودھ کی ضبطی
بھی اس عام فساد کا باعث نہیں۔ (۵) قوم کی سازش واسطے اکھاڑ دینے
غیر قوم کی حکومت کے بھی نہیں۔ (۶) پہلے سے کچھ سازش مسلمانوں میں جہاد
کی نہ تھی۔ بلکہ دلی میں جو جہاد کا فتویٰ باغیوں نے چھاپا۔ وہ دراصل جھوٹا
تھا۔ (۷) پہلے سے فوج میں بغاوت کی صلاح نہ تھی۔ (۸) پہلے سے فوج باغی
کی بادشاہ دہلی سے سازش نہ تھی۔ وہ بیشک دلی کا بادشاہ بھوبل میں
ایک چنگاری تھا۔ جس نے ہوا کے زور سے اڑ کر ہندوستان کو جلا دیا۔" اصل میں یہ
یہ تھی۔ کہ ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں شریک نہ کیا گیا۔ اور گورنمنٹ نے رعایا کے
حالات اور عادات اور خیالات اور اوضاع و اطوار طبیعت اور طینت اور لیاقت کے دریافت
کرنے میں توجہ نہ کی۔ ..... اس سبب سے رعایا کا منشا گورنمنٹ پر نہ کھلا۔ اور گورنمنٹ
کا ٹھیک ٹھیک منشا ہندوستانیوں پر ظاہر نہ ہوا۔ بلکہ برعکس سمجھا گیا۔ (ضمیمہ ص ۱۳)
رعایا کے بھڑکنے کی وجہ یہ تھی۔ کہ (۱) ۱۸۳۳ء کی قحط سالی میں یتیم

پر کے عیسائی کئے گئے۔ وہ تمام اضلاع ممالک مغربی و شمالی میں ارادہ گورنمنٹ
کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے۔ کہ ہندوستان کو اس طرح مفلس اور محتاج
کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ (۲) عیسائی مذہب تلقین کو لوگ سرکار
کی طرف سے خیال کرتے تھے۔ (۳) پادری صاحبان نے دوسرے مذاہب
پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ اور میلوں وغیرہ پر وعظ کرتے تھے۔ (۴) مشنری سکول
اسی غرض سے کھولے گئے۔ (۵) دیہاتی مکتبوں کو لوگ محض عیسائی بنانے
کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ (۶) لڑکیوں کے سکول کا اجرا بھی اسی پر مبنی سمجھا جاتا تھا
(۷) گورنمنٹ کا اشتہار کہ ان کے سکولوں اور کالجوں کے سند یافتہ ہی نوکری
پائیں گے۔ (۸) پادری ایڈمنڈ کی چٹھیات کا اجرا جس میں کہ ہر ایک ہندوستانی
کو دعوت تھی۔ کہ عیسائی ہو جاؤ۔ مسلمانوں کو مذہبی مداخلت سے زیادہ
رنج ہوا۔ کیونکہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے
ہیں۔ نہ بطور احکام مذہب کے۔ انکو اپنے مذہب کے احکام اور عقاید اور وہ
دلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق اُن کے مذہب کے منحصر
ہے۔ مطلق معلوم نہیں ہیں ...... اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت
سست اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے پرہیز کے اور کسی مذہبی
عقیدہ میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے مسلمانوں میں مذہبی
جذبہ پختہ اور وہ متعصب ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ ناراض تھے
اس کے علاوہ ایکٹ ۱۸۵۵ء اور ایکٹ ۱۸۵۶ء کے رُو سے جو بیاہ ہو
سکتے۔ اور بیوگان کی شادی ہو سکتی تھی۔ اس سے ہندو ناراض اور عورتوں

کی فعل مختاری سے دونوں ہندو مسلمان ناراض تھے۔ ضبطی اراضی و
اخراج۔ نیلام زمینداری سختی۔ بندوبست اودھ میں تعلقداروں کا شکست
قانون اشٹامپ کا جاری ہو جانا۔

جب اس کے ساتھ یہ بات شامل کریں۔ کہ (۱) حکام ضلع رعایا سے مطلق
واقف نہ تھے۔ (۲) مفلس ہندوستان میں علی الخصوص مسلمانوں کی نوکریاں
بہت قلیل تھیں۔ روزگار پیشہ جو مسلمان تھے۔ بہت تنگ تھے۔ (۳) اسی
مفلسی کے سبب لوگوں کا ایک آنہ اور ڈیڑھ یومیہ یا سیر بھر اناج پر پائیکوں
کی نوکری اختیار کرنا (۴) ہندوستانیوں سے محبت نہ ہونا (۵) ہندوستانیوں
کی بے توقیری (۶) حکام ضلع کی سخت مزاجی اور بدزبانی۔

مسلمانوں کو یہ باتیں زیادہ تر ناگوار گزرتی ہیں۔ کیونکہ صدہا سال سے
مسلمان ہندوستان میں باعزت چلے آتے ہیں۔ ان طبیعت اور حیثیت
میں ایک غیرت ہے۔ دل میں لالچ روپیہ کی بہت کم ہے۔ کسی لالچ سے
عزت کا جانا اچھا نہیں سمجھتے۔ سرکار کا منشا اچھا تھا۔ لیکن اس کا ظہور نہ
ہونا۔ دربار بند ہو گئے۔ رعایا کو انعام و اکرام بند ہو گئے۔

جن اضلاع میں مسلمان زیادہ تر مفسد دکھائی دیئے۔ اس کا سبب
صرف یہی نہیں خیال کرنا چاہئے۔ کہ دلی سلطنت پر مسلمان بادشاہ نے
دعوی کیا تھا۔ اور وہ حقیقت مسلمان اسی قدر مفسد ہوتے تھے۔
جیسا کہ نظر پڑتے ہیں۔ حکام کا مزاج دفعتاً ان باتوں سے جو ظاہر میں
مسلمانوں سے ہوئی۔ ناراض ہو گیا۔ ان کے مخالفوں کو بڑی گنجائش ہو گئی۔

خود غرضانہ باتیں پیش کرنیکو تھوڑی بات کو بہت بڑھا کر کہا اس میں شک نہیں کہ پانچوں قسم کی بغاوت مسلمانوں میں بہت تھی اور وہ تبدیلئے عملداری کے خیال سے بہت خوش ہوئے تھے۔ بایں ہمہ ہماری گورنمنٹ پر مخفی نہ ہوگا کہ اس حال پر بھی جاں بازی کی خیر خواہیاں اس ہنگامہ میں کس سے زیادہ ظہور میں آئی ہیں!!

اصل پنجم۔ اوّل میں بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج جس کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخلوط کرکے پلٹنوں میں نوکر رکھا۔ اگر مسلمانوں کی جدا پلٹن ہوتی تو شاید مسلمانوں کو کارتوس کے لینے میں عذر نہ ہوتا (گویا ہندوؤں کی بہکاوٹ سے انہوں نے عذر کیا)۔

قوم ہندوستانی کا غدر بڑھ گیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ جب فتوحات ہمارے باعث ہوئی ہیں ایسے وقت میں کارتوس کا دینا غضب ڈھا گیا ساری داستان سے پتہ لگیگا کہ مسلمانوں کی بریت کے سامان پیدا کرتے ہوئے ہندوؤں سے گورنمنٹ کو بدظن کرلینے کی زیادہ تر کوشش پائی جاتی ہے۔ پھر مسلمانوں کی خیر خواہیوں کو ظاہر کرنے کے چند ٹریکٹ بھی شایع کئے اُس کے پہلے ہی نمبر میں سرسید نے لکھا "اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور و غل ہو رہا ہے مگر مسلمانوں کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہونا نہیں چاہئے۔ کیونکہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف ہے۔

پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ ہے تو پھر اس شور و غو

کا انکو کیا غم ہے؟ بلااصل باب اول صفحہ ۹۹) اس رسالہ کو پڑھکر کچھ ہندو خیر خواہان سرکار کو سرسید کے نسبت متعصب ہونیکا خیال پیدا ہوا اُن میں سے راجہ کشن داس سی۔ ایس۔ آئی ایک تھے۔ مگر جب مراد آباد کے محتاج خانہ میں انھیں ہر مذہب وملت کے محتاجوں کے ساتھہ شفقت سے پیش آتے دیکھا تو ان کا دل صاف ہو گیا یہی باعث تھا کہ راجہ کشنداس نے سرسید کے کالج کی سکیم سامنے آنے پر ہندوؤں سے اُنکو بہت کچھہ مالی مدد دلوائی ۱۸۹۵ء میں جب میں پہلے پہل مراد آباد گیا راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ اگر آر یہ کالج کی سکیم پہلے اُن کے روبرو ہوتی تو وہ اسکو بہت کچھ امداد دلواتے۔ اُس وقت وہ سرسید کی ہندوؤں سے مخالفت کے باعث اُن سے وہ بدگمان ہو چکے تھے۔

سرسید نے اس کے بعد جس قدر رسالے لکھے اُن میں عیسائیوں سے مسلمانوں کی یگانگت کے راگ گائے۔ لفظ نصاری کی نئی تعبیر کی عیسائی کو اہل کتاب بتلا کر اپنے تئیں بے کتاب ہندوؤں کی نسبت عیسائیوں سے زیادہ نزدیک ثابت کیا ۱۸۶۳ء میں سرسید علی گڑھہ چلے گئے وہاں سے ۵ اگست ۱۸۶۷ء کو آج کی تبدیلی بعہدہ جج بنارس کو ہوئی

ایک طرف تو سرسید ہندو مسلمانوں کو اپنی دو آنکھوں سے تشبیہ دیتے تھے اور اس تشبیہ سے اپنے ہم مذہبوں کو فائدہ پہونچاتے اور دوسری طرف برٹش افسروں کو ہندوؤں سے دور لیجانے میں کوشاں تھے ہندوؤں کو شکایت ہے کہ سرسید نے ہندوؤں کے برخلاف خفیہ طور پر گورنمنٹ

برطانیہ کو بھڑکایا۔ چنانچہ اس پر مولانا حالی نے یہ رنگ چڑھایا ہے کہ چونکہ تاریخ ہندوستان مروجہ سکولوں و کالجوں میں مسلمانوں کے برخلاف متعصب آمیز تحریروں سے جذبہ پیدا کیا جاتا تھا اور اُن میں مسلمانوں کی برائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی ہیں اس لئے ہندوؤں کو اُن سے نفرت ہوتی گئی۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ غالب پارٹی (مراد ہندوؤں سے ہے) اپنے لئے اقتدار کا جو اس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور اُمنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اس بہانے سے کہ دریا میں خاک کیوں اڑاتے ہو اس سے دست گریباں ہو جائیں (صفحہ ۱۳۹)

۱۸۶۷ء میں ہندی کی حمایت میں ہندوؤں نے بنارس میں آواز اُٹھائی کہ ایک ہندی بھاشا پرچارنی صدر سبھا الہ آباد میں قائم ہوئی اور اس کی شاخیں جابجا کھولی گئی تھیں دونوں لفٹنٹ گورنر بنگال بھاگلپور کی سوسائٹی میں آئے انہیں اردو میں اڈریس دیا گیا عربی اور فارسی کے الفاظ کی کثرت ہونے کی وجہ سے اُن کی سمجھ میں نہ آیا اُنہوں نے حکم دیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حروف اور ہندی زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہے جاری ہو۔ ہر چند مسلمانوں نے اور بہت سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی ہو جائے مگر نتیجہ [illegible]

[illegible] مرکزی کمیٹی کے

کے سکریٹری بابو سرودا پرشاد سانیال نے سرسید سے خط وکتابت کی اور یہ مباحثہ اخباروں میں شائع ہوتا رہا ہے

سرسید نے اس کی صریح مخالفت کی اور چونکہ ان کے پرانے دوست سر جان سٹریچی ممالک شمال مغرب کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ اس لئے ہندوؤں کا کچھ بس نہ چلا۔

۱۸۸۲ء میں جب سرسید وائسرائے کی لیجس لیٹیو کمیٹی میں ممبر تھے۔ ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اردو قائم کی۔ مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہ دی ہم نے ایسے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقہ سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے

اب سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھیں سمجھنا بھول گئے تھے اور اس لئے فخر ہند لالہ لاجپت رائے نے اُن کے نام وہ تین مشہور کھلی چھٹیاں لکھی تھیں جو بعد میں مسٹر ہوم نے چھپوا کر تقسیم کی تھی۔ وہ ہندوؤں کی کھلی مخالفت پر تل گئے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ زیادہ تر رابطہ اتحاد بڑھانے کے لئے انھوں نے یہ رائے دی کہ جو مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانے میں کتراتے ہیں وہ ان کی غلطی ہے اگر کوئی ممنوع اشیا نہ ہوں تو انگریزوں کے ساتھ ہندوستان کیا تمام دنیا کے مسلمانوں کو کھانا کھا لینا چاہئے۔ خوب بحث چھڑی بعضوں نے اس بات میں کوشش کی سرسید کے ساتھ مسلمان کھانا

پینا چھوڑ دیں مگر بقول سر سید کے وہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک بگولا اُٹھا اور خاک اُڑا کر چلا گیا پھر مطلع صاف ہو گیا اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے ہاں جا کر اور اُنکو اپنے ہاں بلا کر اپنے ساتھ کھانیکو اپنا فخر سمجھتے ہیں البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تقویٰ اور طہارت پر بدستور قائم ہیں" (صفحہ ۱۳۷، 1464)

سر سید کے حُب قومی کے واقعات ابھی باقی ہیں اُن کے لئے کچھ اور لکھنا ہوگا

مولانا حالی نے اردو کو ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت" بتلایا ہے لیکن ہندو اسکو ہندی کی تنزل یافتہ صورت سمجھتے تھے اگر یہ مقولہ صحیح ہے کہ ایک زبان اُس کے بولنے والوں کی تہذیب کا صحیح مرقع ہے۔ تو ہندی کو اردو کا جامہ پہنانیکا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں کی تہذیب اسلامی تہذیب میں بدل دی جائے۔ اس امر کے شاہد وہ تمام استعارات ہیں جو فی زمانہ اُردو دا ہندوؤں کے اندر بھی مُرّوج ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے تعلق کو چولی دامن کے تعلق کے ساتھ تشبیہ دیجاتی ہے۔ اسپر آج تک کسی ہندو نے غور نہیں کیا۔ یہاں ہندو بجائے چولی کے اور مسلمان بجائے دامن کے سمجھے گئے ہیں چولی سے مراد بیوی اور دامن سے مراد خاوند کا ہے گویا ہندو اور مسلمانوں کا تعلق اگر بیوی اور خاوند کا ہو جب ہی ٹھیک رہ سکتا ہے۔ ورنہ انکا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی بات بات پر مسلمان دھمکی دیتے ہیں کہ اگر اُن کے حسب دلخواہ ہندوؤں کا چال چلن نہ ہوگا تو وہ اتحاد کو توڑ دیں گے گویا ہندو بیوی کو سرکشی کرنے پر طلاق دیدیں گے۔

سرسید کا رخ بدلا

مولانا حالی لکھتے ہیں چنانچہ ۱۸۶۸ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے" (صفحہ ۱۴۷)

اس کے بعد گو ہندوؤں کی عدم واقفیت کی وجہ سے سرسید ہزاروں روپیہ کا چندہ اُن سے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وصول کرتے رہے تاہم ہندوؤں کو اُن کے صحیح خیالات کا پورا پتہ نہ چلا۔

یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو اپنے بڑے بیٹے سید محمود کو واسطے حصول تعلیم داخل کرانے کی غرض سے انگلینڈ کو روانہ ہوئے وہاں ۶۔ اگست ۱۸۶۹ء کے دن انہیں سی ایس۔ آئی کا خطاب ملا ۱۸۷۰ء کو وٹ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کر کے چندہ شروع کیا پھر مدرستہ العلوم علی گڈھ کی تحریک شروع کی۔ میں ۱۸۷۲ء کے اول چھ مہینوں بنارس میں تھا جب سرسید وہاں کے صدر الصدور تھے اس زمانہ میں بنارس میں بھی مدرستہ العلوم کے لئے چندہ ہوا جس میں ہندوؤں نے بھی کافی مدد دی ۱۸۷۳ء میں ابتدائی مدرسہ علی گڈھ میں قائم ہوا اور بڑھتے بڑھتے ۸ جولائی ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے ہند کے ہاتھ سے علی گڈھ کالج کی بنیادی رسم عمل میں آئی۔

۱۸۷۷ء کی یکم جنوری کو لارڈ لٹن نے بمقام دہلی پہلا شاہی دربار کیا۔ اسی
موقع پر ملکہ وکٹوریہ نے قیصر ہند کا خطاب منظور کیا تھا اس موقع پر سر سید احمد
نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کی خاص ملاقات بذریعہ راجہ
جے کشن داس صاحب ہوئی اور غالباً دہلی سے سر سید تفسیر القرآن نئے ڈھنگ پر
لکھنے کے خیالات لیکر واپس آئے اس کے بعد انہوں نے تہذیب کا معیار یہ قائم
کیا کہ اس میں کوئی بات قانون فطرت کے مخالف نہ ہو۔ سر سید میں ایک بڑا وصف
یہ تھا کہ انہیں ہر ایک جگہ سے اپنے ہم مذہبوں کی بہتری کے سامان اکٹھا کرنے
میں کوئی عار نہ تھی انہوں نے اپنے طرز عمل اور تلقین سے مسلمانوں کے بہت
سے توہمات کو دور کر دیا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قائم کرنے کے وقت سر سید نے
کمال دانائی سے کام لیا۔ اگر ہندوؤں سے مالی مدد نہ ملتی تو اس عالیشان درسگاہ
کا کھڑا ہونا مشکل تھا۔ باوجودیکہ اپنے ہم مذہبوں کی ترقی کے لئے انہوں نے
ہندوؤں کی مخالفت کی تاہم اسے اس وقت تک ظاہر ہونے نہ دیا جب تک کہ
حالات نے انہیں مجبور نہ کر دیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سر سید کی یہ پالیسی ہمیشہ
سچائی کے اصول کے مطابق تھی لیکن سیاسی نگاہ سے اپنی جماعت کی حفاظت
اور ترقی کے لئے جو ذرائع معمولی طور پر دنیا میں استعمال کئے جاتے ہیں ان میں
سچائی کے اصول کا پاس رکھنا مشکل ہو جاتا ہے ۱۸۷۹ء کے درمیانی حصہ میں
راقم الحروف خود علی گڑھ کالج میں بطور طالب علم داخل ہونے کی غرض سے
گیا میرے بنارس کالج کے دوست پنڈت راما شنکر مشر ایم اے وہاں
ریاضی کے پروفیسر تھے کیونکہ ان دنوں مسلمانوں میں ریاضی کا ایم اے

کوئی دیکھائی نہ دیتا تھا میرے مشاہدے - وہ تجربے کا نتیجہ یہ تھا کہ گو بڑا حصہ
مالی امداد کا ہندوؤں سے آیا تاہم ہندو طلبا کی پڑھائی اور رہائش کا انتظام معقول
نہیں یہی وجہ تھی کہ دس پندرہ دنوں کے قیام کے بعد ہی میں وہاں سے
لوٹ آیا۔ اسوقت سے ہی علی گڑھ محمڈن کالج کا کرہ ہوائی ہند و تہذیب کے
برخلاف قائم ہو چکا تھا۔

سنہ ۱۸۸۵ء کے دسمبر میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ہوا۔
گویا اس کا بنیادی پتھر رکھا گیا سر سید احمد کو یہ بات بہت کھٹکی اور انہیں فکر
دامن گیر ہوا کہ اگر مسلمان اس میں شامل ہوگئے تو جو خاص رعایت ان سے ہم
مذاہب کے ساتھ گورنمنٹ وقت کی طرف سے کیجاتی ہے وہ بند ہو جائے گی اور
اس سے مسلمانوں کو نقصان پہونچیگا۔

چنانچہ مسلمانوں کی توجہ دوسری طرف کھینچنے کے لئے انھوں نے سنہ ۱۸۸۶
کے شروع سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اعلان شروع کر دیا اور جب دوسری
کانگریس کا اجلاس دسمبر سنہ ۱۸۸۶ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا تو انھیں تاریخوں میں
سر سید نے اپنی کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں بلوایا۔

سنہ ۱۸۸۷ء کے ابتدائی حصہ میں سر سید کانگریس کے برخلاف مسلمانوں
کے اندر خیالات پھیلاتے رہے۔ چنانچہ بحیثیت ممبر پبلک سروس کمیشن کے
وہ ان دنوں پنجاب میں تشریف لے گئے تو جن مسلمان تعلیم یافتہ اصحاب کا
ہندوؤں کے ساتھ اُس وقت تک برادرانہ سلوک تھا۔ انہیں ترکی ٹوپی پہننا
سکھایا اور خاص تلقین کر کے کانگریس اور ہندوؤں کی برخلاف کر گئے اُسیوقت سے پنجاب میں بھی یہ تفرقہ کا ظہور ہوا

اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی شروع ہوگئی

۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا مسلمانوں کے عام جلسے میں سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے برخلاف ایک نہایت مفصل اور پرزور لیکچر دیا تو جو اُن کی اسپیچوں کے مجموعے میں چھپ گیا ہے۔ دیکھو حیات جاوید صفحہ ۲۷۱۔ اس کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء بمقام میرٹھ اُنہوں نے دوسرا لیکچر اس قدر طولانی دیا جیسا کہ لکھنؤ میں دیا تھا۔ مسلمانوں کے عام جلسے میں دیا۔ اس لیکچر کا مقصد اس بات کا ثابت کرنا تھا کہ کانگریس والوں نے جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ معدودے چند مسلمان جو اُس میں شریک ہوئے ہیں اُنہوں نے غلطی کی ہے۔ ان دونوں لیکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پرانے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سرسید کی ہر ایک رائے اور ہر ایک تجویز کی مخالفت یا اُس سے نفرت ظاہر کرتے تھے اُنہوں نے بالاتفاق اُن کی رائے کو تسلیم کیا (صفحہ ۲۲۶) اسی طرح پر پرانے خیالات کے مسلمانوں پر بھی جو نیچری مذہب سے متنفر تھے اپنی تقریر کا جادو چلا اور سب جاہل اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے بڑے حصہ کو ہندوؤں کے مخالف بنا کر سرسید نے دونوں جماعتوں کے درمیان ایک مستقل خلیج قائم کردی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

اس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے بمقام علی گڈھ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اس غرض سے قائم کی کہ جو تو میں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ

کانگریس میں شریک نہیں ہیں اُن کی رائے اور خیالات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کیجائے،،

(صفحہ ۲۷۶) پھر مولانا حالی اقرار کرتے ہیں کہ

"بنگالی اخباروں میں سرسید کی اس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور اُن کے برخلاف بڑے بڑے تلخ آرٹیکل لکھے گئے سب سے بڑا اعتراض اُن پر یہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے ریپرزنٹیو اصول کے بڑے طرفدار رہے ہیں اور اُن کی تمام اگلی تحریروں اور اسپیچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس پر جو ہندوستان میں ریپرزنٹیو اصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے معترض ہیں؟ ایضاً

سرسید پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے جبکہ بابو سریندرو ناتھ بنرجی علی گڑھ میں آئے تھے اور انہوں نے نیشنل فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تھی اُس وقت سرسید نے کیوں اُنکے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا؟ اور کیوں اُس جلسہ میں صدر انجمن بنے تھے جو نیشنل فنڈ جمع کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا اور جبکہ وہ فنڈ اسی لئے جمع کیا جاتا تھا کہ تمام ہندوستان کی طرف سے پارلیمنٹ میں جو درخواستیں بھیجی جائیں یا جو استغاثہ پیش کئے جائیں اُن کے اخراجات میں صرف کیا جائے تو پھر ان سب حملوں کا جواب سرسید کی طرف سے کچھ نہ دیا گیا" اگرچہ

اُن کو۔۔۔۔ خوشامدی زمانہ ساز نام سر دھرا اور کیا کیا کہا گیا مگر۔۔۔۔ کسی کے
کہنے پر مطلق التفات نہیں کیا یہانتک کہ نکتہ چینیوں کے ترکش خالی ہوگئے
اور سب کی زبانیں بند ہوگئیں ؎

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا" صفحہ ۲۸۲

نتیجہ یہ ہوا کہ مئی ۱۸۸۸ء میں سید احمد خاں کو اعزاز نائٹ ہڈ
آف دی سٹار آف انڈیا" کا بخشا گیا اور ۱۴ مئی کو علی گڈھ میں بڑا بھاری
جلسہ ہوا اور وہ سر سید بن گئے۔

سرسید کی وصیت

۱۴ مئی ۱۸۸۸ء سے لیکر ۱۸۹۸ء کے پہلے حصہ تک
مسلمان جماعت پر سر سید کا پورا اقتدار رہا اُن کی
شخصیت نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے ملنے نہ دیا اور جب ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء
کے دن انہوں نے وفات پائی تو زبان حال سے وہی وصیت ہندوستان
کے مسلمانوں کے لئے چھوڑ گئے۔ اپنے مربی کی وفات کے بعد بھی مسلمانان
ہند برابر اپنی جماعت کی مادی ترقی میں لگے رہے۔ اور انہی کی دیکھا دیکھی خالصہ
پنتھ کے ایک حصہ نے بھی اپنے آپ کو اپنے انگریز فرمانروایان کے سپرد
کر کے اپنا تن اور من انہیں کے ارپن کر دیا لیکن ابھی تک اگر سکھوں کا خاص
حصہ انگریزی نوکر شاہی کا بایاں ہاتھ بنا ہوا تھا تو مسلمان ضرور ان کی سلطنت
کے استحکام کا دایاں ہاتھ تھے۔

عیسوی کی بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ملکہ وکٹوریہ کا دیہانت ہوگیا۔ انگی

جانشین ایڈورڈ ہفتم ہوئے اور اُن کی رسم تاج پوشی بھی لندن میں ادا ہو چکی تھی لارڈ کرزن وائسرائے ہند تھے وہ سادہ لوح ہندوستانیوں کے دلوں کو تماشے دکھا کر تسخیر کرنا چاہتے تھے۔

۱۹۰۲ء کے خاتمہ پر ہی دہلی میں چہل پہل ہو گئی کانگریس کا جلسہ تو متانت اور شانتی کے ساتھ احمد آباد میں منایا گیا لیکن برٹش گورنمنٹ کے خاص منظور نظروں نے "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کا اجلاس خاص دہلی میں بُلایا۔ اُس اجلاس کے صدر سر آغا خاں صاحب قرار پائے اور جلسہ میں بڑے بڑے اعلیٰ انگریز عہدہ دار شامل ہوئے اُس اجلاس کا حال اپنے اخبار ست دھرم پرچارک میں درج کرتے ہوئے میں نے ۱۶ جنوری ۱۹۰۳ء کو لکھا تھا۔ گو مسلمان شور و شر مچا کر اپنے ہم مذہب اصحاب کو جگانا مناسب سمجھتے ہیں تاہم میری رائے میں اُن کی تعلیمی حالت بہ نسبت ہندوؤں کے گذشتہ دس برسوں کے عرصہ میں بدرجہا ترقی کر گئی ہے۔ دوسری خصوصیت اس (مسلمانوں کی تعلیمی) کانفرنس کی یہ تھی کہ جہاں ہندوؤں کے کسی بھی جلسہ کو حکام عالی مقام نے اپنی شمولیت سے فخر نہیں بخشا وہاں اہل اسلام کی اس تعلیمی کانفرنس میں (۱) نواب گورنر بہادر بمبئی (۲) نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک متحدہ آگرہ واودھ (۳) سر ہاورڈ و نسینٹ ممبر پارلیمنٹ (۴) جناب صاحب پریزیڈنٹ حیدر آباد دکن (۵) لارڈ کچنر کمانڈر انچیف ہند (۶) سر مائیکل ایکس بیچ سابق وزیر خزانہ سلطنت برطانیہ (۷) ارل آف ہیمبرگ اور دیگر بہت سے حکام شریک ہوئے نہ صرف شریک ہی ہوئے

بلکہ آخرالذکر تین اصحاب نے نہایت ہمدردانہ تقریریں کیں ....

ایک وجہ اس کی تو مسلمانوں کا باہمی اتفاق اور دوسری وجہ مسلمانوں پر حکام کی شفقت کا یہ ہے کہ مسلمانوں کی آزاد سلطنتیں ٹرکی فارس۔ کابل وغیرہ اب تک ایسی موجود ہیں جو سرکار برطانیہ کی برابری کا درجہ رکھتی ہیں اور ہندوؤں کی جو ایک ہی آزاد سلطنت نیپال ہے اُسکے فرمانروا و باشندے اپنے ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ کچھ واسطہ ہی نہیں رکھتے..... سب سے آخری اور نہایت ضروری امر جو اس کانفرنس میں طے ہوا وہ یہ تھا کہ علی گڈھ کالج یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کے لئے ایک کروڑ روپیہ کی اپیل کی جاوے اس ضمن میں لارڈ ہیمبرک نے کہا کہ چھ کروڑ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ یونیورسٹی کا ہونا نہایت ہی ضروری ہے..... کیا آریہ سماج کا فرض نہیں ہے کہ ہندوؤں کے سُدھار اور اُن کو رشیونکی سیدھی سڑک پر چلانے کے لئے چار یونیورسٹیاں قائم کرے۔؟..... مسلمان تو خود کوشش کرلینگے اور باوجود اظہار تعصب کے ہندوؤں سے بھی مدد لیکر اپنی یونیورسٹی قائم کرہی لینگے لیکن آریہ سماج کے ہر ایک کام میں ہنوز روز اول ہی رہیگا۔

ہندو مسلمانوں کے درمیان جو نااتفاقی کی وسیع خلیج سرسید احمد خاں نے قائم کردی تھی وہ رفتہ رفتہ ہندوؤں کی طرف سے تو بحر فراموشی کی نذر ہونی شروع ہوگئی۔ مگر مسلمانوں کے اندر اُسکا جذبہ برابر کام کرتا رہا چنانچہ جب سر انٹونی میکڈانلڈ کے زمانہ میں ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ ممالک شمال و مغرب آگرہ و اودھ کے اضلاع میں ناگری حروف میں

لکھی ہوئی عرضیاں اور دستاویزات بھی عدالتیں منظور کر لیا کریں تو اس
وقت مسلمانوں کی طرف سے از سر نو ہندی کی بڑی بھاری مخالفت ہوئی
وہ تحریک تو مسلمانوں کے رد کرنے سے رکی لیکن نفاق ختم نہ ہوا۔

۱۹۱۰ء کے دسمبر مہینے میں کانگریس کا اجلاس الٰہ آباد میں ہوا تھا۔ اس
سال وہاں ایک بڑی بھاری نمائش کی بھی تیاری تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے
سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کا کام جاری تھا اور تجویز یہ پیش ہو رہی تھی کہ
جب ہندو اچھوت جاتیوں سے اتنی نفرت کرتے ہیں تو ان کا شمار ہندوؤں
میں کیوں کیا جائے اس پر مسلمانوں کی طرف سے خاص زور دیا جا رہا تھا تب
ہندو گھبرائے اور یہاں تک بولنے لگے کہ کاشی پوری کے اندر پنڈت ست
شو کمار شاستری نے ایک جلسہ میں ڈوموں کو فرش پر بیٹھنے کی اجازت
دیدی۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا لیکن جس بات کی طرف میں توجہ کھینچنا چاہتا
ہوں وہ یہ ہے کہ اس سال کانگریس کے صدر ہندوستان کے پرانے
دوست سر ولیم ویڈربرن مقرر کئے گئے تھے اور انہوں نے اس بڑی عمر
میں ہندوستان کا ایک مقصد یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کیلئے
کوشش کریں اس جلسہ میں ہندوؤں کی طرف سے مہاراجہ دربھنگہ اور
مسلمانوں کی طرف سے سر آغا خاں صدر جلسہ قرار پائے تھے مجھے بھی
اس جلسہ میں شرکت کا موقع ملا۔ مسلمانوں کی طرف سے تجویز ڈالے گئے
گؤ کشی کے سوال کو تو بالکل ہی ٹال دیا گیا تھا اگر مسٹر جسٹس شاردا
چرن مترا [illegible] رہے لیکن ہندی اردو کے سوال پر مسلمانوں

کا پورا زور تھا ایک مسلمان نوجوان لیڈر نے تو یہاں تک کہدیا کہ اردو ہندوستان کی راشٹر بھاشا ہے اور اس لئے
جب تک ہندی کی حمایت دور نہیں ہوتی تب تک ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے ہندی کی قدامت کو تو جو الہ جات سے پنڈت مدن موہن مالویہ جی نے ثابت کیا تھا اور عام اعتراضوں کا جواب میں نے دیا تھا۔ ہندو اسوقت بھی ہر طرح کا سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار تھے لیکن مسلمان اپنے آپ کو گورنمنٹ وقت کے منظور نظر رکھتے ہوئے کسی بھی سمجھوتے کے لئے تیار نہ ہوئے

اس کے بعد مسلم لیگ اگر قائم ہوئی تب بھی ہندوؤں سے ایک طرح کی علیحدگی ہی رکھی گئی۔ اس میں شبہ نہیں یہ کانگریس سے علیحدگی کے باعث جو پولیٹیکل نقصان مسلمانوں کو پہونچنے کا احتمال تھا اسکے خیال نے انہیں سیاسی میدان میں قدم رکھنے کے لئے مجبور کیا لیکن وہاں بھی ان کا منزل مقصود ہندوؤں پر سبقت لیجانا تھا۔ متفقہ ہندوستانی قوم کی آزادی کی طرف راہبری مقصود نہ تھی۔

مولانا محمد علی اسوقت مسٹر محمد علی تھے اور مجھے ان سے پہلے اول دسمبر ۱۹۱۱ء کے شاہی دربار کے موقع پر ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے گورو کل کی نسبت مجھ سے بات چیت کی اور وہاں پہنچ کر اس سنستھا کو دیکھنے کا اقرار کیا اسکے کچھ عرصہ بعد مسٹر محمد علی نے اپنا انگریزی اخبار "کامریڈ" نام سے دہلی سے نکالنا شروع کیا۔ اسکے پہلے نمبر میں ہی ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف سکھوں کی تعریف کی گئی مضامین میں یہ ظاہر کیا کہ وہ اتحاد کی کوشش کریں گے لیکن

شاید دوسرے یا تیسرے نمبر میں ہی قومی تعصب کی بُو آنے لگی۔ باینہمہ جب کچھ عرصہ کے بعد ٹرکی کی حمایت میں مضامین لکھنے کے باعث ان کے اخبار سے ضمانت طلب کی گئی تو میں نے ہی ہندوؤں کو بھی چندے سے مدد دینے کے لئے پریرنا کی۔

۱۹۱۴ء اگست میں یورپ کا جنگ عظیم شروع ہو گیا۔ اس عرصہ میں باہمی ایک دوسرے کے نزدیک ہونے کا موقعہ ملتا رہا لیکن درمیان میں جہاں اجودھیا اور آرہ کے فسادوں نے کرۂ ہوائی کو مکدر کر دیا وہاں ۱۹۱۶ء کی لکھنؤ کانگریس پر جو عہدنامہ باہمی ہوا اور جس موقعہ پر ہندوؤں نے بڑی فراخدلی سے کام لیا اس کے باعث سیاسی طور پر اختلافات میں بہت کمی ہونے لگی لیکن ۱۹۱۸ء کے ماہ ستمبر میں گائے کی قربانی کے متعلق کٹارپور میں ہندوؤں کی طرف سے بڑی بے رحمی اور وحشی پن کا اظہار ہوا۔ میں نے خود ہندوؤں کی اس حرکت کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ مقدمہ میں گو بیگناہ بھی بہت سے سزایاب ہو گئے لیکن ایسے ہولناک موقعوں پر معصوم اور گناہگار کی تمیز کرنا مشکل ہے۔ ایک گائے کی قربانی کے شبہ میں چالیس انسانوں کو بیرحم وحشیوں کی طرح ہلاک کرنا انسانوں کا کام نہیں سمجھا جا سکتا یہی وجہ تھی کہ دسمبر ۱۹۱۸ء کے دہلی کانگریس کے اجلاس پر پنڈت مدن موہن مالویہ نے وہ قابل یادگار الفاظ کہے تھے کہ اگر میرے مسلمان بھائی کی مذہبی خوشی اس میں ہے کہ وہ گائے ذبح کرے تو میں کھڑے ہو کر اس کو دیکھنے کیلئے تیار ہوں۔ مگر اپنے بھائی کی ناراضگی گوارا نہیں کر سکتا۔ ہند و مسلم اتحاد کی ایسی حالت تھی جب ۱۹۱۹ء کے شروع میں یورپ کے جنگ عظیم سے

فارغ ہو کر ہندوستانیوں کے گلے راولٹ ایکٹ منڈھنے کی تیاریاں ہوئیں
مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ کا اعلان کیا اور میں اس میں شامل ہو گیا
میں محض معمولی ممبر تھا۔ دہلی ستیہ گرہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر مختار احمد
انصاری صاحب تھے سکرٹری لالہ شنکر لال تھے۔ خزانچی مسٹر ڈیسائی
سارے ملک کی متفقہ آواز کی مخالفت کے گورنمنٹ وقت نے
زبردستی رولٹ بل کو ایکٹ بنا کر ملک کے گلے ٹھونس دیا ہیں جبکہ ایک
خاص کام کے لئے بمبئی گیا۔ تو مہاتما گاندھی نے مجھے ستودت۔ بھڑوچ اور
احمد آباد ہو کر دہلی لوٹ جانے کے لئے کہا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ خود مدراس کی طرف
جا رہے تھے۔ ۲۴۔ مارچ ۱۹۱۹ء کو میں دہلی واپس آیا یہاں آ کر دیکھا تو سرگرمی
ہی سرگرمی دکھائی دی مہاتما گاندھی کی ہدایت تھی کہ وائسرائے کے بل کی
منظوری دینے کے بعد جو اتوار آوے اس پر سارے ملک میں ہڑتال کیجاوے
۲۴۔ مارچ ۱۹۱۹ء کے دن وائسرائے نے منظوری دی۔ دہلی میں اسی وقت
معلوم ہو گیا لیکن باہر خبر دیر سے پہنچی اس لئے دہلی میں ہڑتال کی تیاری کر دی
گئی ۲۷۔ مارچ کو جو جلسہ ہوا اس میں حاضری دس بارہ ہزار تھی لیکن ابھی تک
یہ اُمید پختہ نہ تھی کہ مسلمان بھی بطور ایک جماعت کے ہڑتال میں شامل ہونگے
۳۰۔ مارچ کو اتوار تھا اس لئے اسی دن کے لئے ہڑتال کا فیصلہ کیا گیا ۲۹۔ مارچ
کو پھر جلسہ بلایا گیا اس شام کو حاضری بیس ہزار سے بھی زیادہ تھی مگر صدر
ستیہ گرہ کمیٹی دہلی میں موجود نہ تھے میں نے عارضی صدارت منظور کر کے
ہڑتال کے لئے ہدایات سنا دیں۔ اُس دن مولانا احمد سعید صاحب بھی

دل کھولکر بولے ہندوستانی اقوام اور خصوصاً مسلمانوں کے ساٹھ سالہ غلطی کا
اعتراف کرکے اُنہوں نے باہمی اتفاق کے لئے ایک زبردست اپیل ہیں میری
تائید کی اور جلسہ کی برخاستگی پر مجھے کہا "مسلمانوں کی طرف سے بھی مطمئن
ہوجائے محض لالہ شنکر لال اور پروفیسر اندر کچھ عرصہ کے لئے میرے ساتھ
چلے چلیں سب معاملہ ٹھیک ہوجائیگا۔

۳۰ مارچ کی صبح کو نوکرشاہی نے دیکھا کہ مکمل ہڑتال ہے۔ وہ نظارہ
قابل دید تھا ایک بجے ریلوے سٹیشن پر گولی چلی متعدد مارے گئے اور بہت سے
زخمی ہوئے پھر ٹاؤن ہال کے سامنے گولی چلی مفصل حال بیان کرنے کی ضرورت
نہیں لیکن جب ۳۱ مارچ کی صبح کو پہلے مسلمان شہید کا جنازہ نکلا تو بھیڑ کا
کچھ ٹھکانہ نہ تھا اسی جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے میری حکیم اجمل خاں سے ملاقات
ہوئی۔ بغیر بولے ہی ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے جنازہ زیادہ تر ہندوؤں
کے کندھوں پر گیا۔ قبرستان میں پہنچکر باہمی محبت کا دریا اُمڈ آیا۔ تیسرے پہر ہندو
مسلمان دونوں کے جنازے اُٹھے۔ ہندو شہیدوں کی ارتھیاں مسلمانوں کے کندھوں
پر شمشان بھومی میں پہنچیں۔ اور یہی سلسلہ برابر جاری رہا اس وقت کسی مسلمان کو بھی
خیال نہ ہوا کہ کافر کی لاش کو کندھا دینا گناہ ہے اور نہ ہی مسلمان شہید کے جنازہ
پر آریہ سنیاسی اور ہندو پنڈتوں نے شانتی کے لئے پرارتھنا کرنیکو پاپ سمجھا ۳۰
مارچ سے لیکر ۱۸ اپریل ۱۹۱۹ء تک ہڑتال چلی ان ۱۹ دنوں کی حالت کو یکزبان
ہوکر سب نے رام راج کا خطاب دیا تھا۔ آج مسلمان بدمعاشوں کی شکایت ہے
کہ وہ ہندو دیویوں کی عصمت دری کرتے ہیں اس وقت شراب خانے اور جوئے کے

دروازے بند ہو گئے جنہیں بدمعاش سمجھا کرتے تھے دیویوں کی عزت کرتے دیکھے گئے
ہندو محلوں سے مرد بالکل غیر حاضر اور عورتیں اطمینان سے بیٹھی ہیں ان ۹ دنوں
میں نہ کوئی چوری ہوئی نہ کوئی تالا ٹوٹا اور نہ کوئی لڑائی ہوئی۔ آہ! کیا زمانہ تھا
ایک بنئے کی جیب میں نوٹ تھے ایک پانچ روپیہ کا نوٹ ابھرا ہوا تھا۔ ایک لڑکے
نے نکال لیا پولیس مین نے تاڑ لیا۔ فوراً لڑکے کو پکڑ کر لالہ کے سامنے کیا سپاہی
بولا لالہ جی جیب دیکھئے اس لڑکے نے آپ کا نوٹ نکال لیا لالہ جی بولے نہیں
ہمارے تو سب نوٹ ٹھیک ہیں اسے چھوڑ دو لڑکا چھوٹا اور لالہ جی چل دیے
پھر سے دوسری طرف چلے تو لڑکا جا کر قدموں پر گر پڑا۔ یہ لڑکا مسلمان تھا۔
رو کر بولا یہ نوٹ لیجئے میں بڑا کم بخت ہوں۔ لالہ بولے بچہ تو نے جان بوجھ کر یہ کام
نہیں کیا تجھ کو ناداری نے تنگ کیا ہو گا معلوم ہوا کہ ماں اور بہن بھوکی تھی اس
لئے یہ حرکت سرزد ہوئی۔ اب لالہ زور دیتے ہیں کہ لڑکا نوٹ لیجائے اور وہ
رو کر کفارہ کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ اپریل کو جمعہ کا دن تھا جامع مسجد دہلی میں نماز کے بعد شہیدوں کے لئے
دعا پڑھی جاتی تھی صبح ہندو بھائیوں نے پوچھا سوامی جی مسلمان بھائی زور
دیتے ہیں کہ ہم لوگ بھی جامع مسجد میں جائیں ہمیں کیا کرنا چاہئے میں نے صلاح دی
کہ بغیر حکیم صاحب کے مشورہ کے انہیں نہیں جانا چاہئے میں خود ۱۲ بجے اپنے ڈیرہ
پہنچ کر چٹھیاں لکھنے کا کام کرنے لگ گیا اس لئے کہ نماز کا وقت گذر جائے تب شہر کی
طرف چلوں ڈیڑھ بجے پچاس ساٹھ مسلمان بھائی ہڑبڑا کر میرے دو منزلے
کمرے پر چڑھ آئے اور مجھے مجبور کر کے لے گئے جامع مسجد میں ۳۵ ہزار سے

کم کی حاضری نہ ہوگی مجھے گھسیٹ کر ممبر کے پاس لے گئے ہیں جھجھکا اور ساری جماعت نے آخر کار ایک زبان ہو کر زور دیا کہ میں ممبر کے اوپر چڑھ جاؤں وہاں بیٹھتے ہی مجھے تقریر کے لیئے ہدایت ہوئی میں نے اپنا دل کھولکر رکھدیا اور شانتی اور امید کے ساتھ شہیدوں کے لیئے دعا ختم کی

اتحاد دن بدن مضبوط ہوتا گیا۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب کمیلے کے سامنے میدان میں قصابوں کے ایک بوڑھے بزرگ چودھری نے کہا

"آج ہم کٹار پور اور آگرہ سب بھول گئے ہیں"

دہلی سے شروع ہو کر ہندو سنیاسی اور پنڈت مسجدوں اور مسلمان مولوی اور علما مندروں میں وعظ دینے لگ گئے۔ مشترکہ آفت کے وقت اتحاد شروع ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی کی روحانی طاقت کے زیر سایہ مضبوط ہوتا چلا گیا مگر ایک غلطی ہوئی جسکا خمیازہ اسوقت ہم سب بھگت رہے ہیں اتحاد کی بنیاد ایک طاقت کیلئے نفرت کے اظہار پر رکھی گئی۔ لیکن اسوقت موقعہ ہی ایسا تھا اور سوچنے کیلئے کسی کو بھی کچھ موقع نہ ملا۔

پنجاب میں اس اتحاد کا بڑا زبردست اظہار ہوا اور جلیانوالے باغ نے آنا وقت کیلئے ہندو سکھہ اور مسلمان سب کو ایک جان بنا دیا ہے امرتسر کانگریس کے موقع پر جہاں مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس میں ہندو شریک ہوئے وہاں سکھ لیگ بھی قائم ہو گئی اور کانگریس کے نمایندوں کو سکھوں کی طرف سے نمایندگی دی گئی اسکے بعد کلکتہ میں کانگریس کا سپیشل اجلاس ہوا وہاں میں نے کچھ کچھ آثار ایسے دیکھے جس سے گمان ہوتا تھا کہ یہ اتحاد دیر تک قائم نہ رہ سکیگا

کلکتہ میں خلافت کمیٹی نے جو رزولیوشن پہلے پاس کر دیے کانگریس کو مجبوراً ان
کی پیروی کر لی پڑی اسکے سوائے ہندوؤں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ مسلمان اُس
وقت تک اتحاد قائم رکھنے کیلئے طیار ہیں۔ جب تک کہ اونکے سب مذہبی اور مجلسی
مطالبے ہندو سن وعن مانتے چلے جاویں۔ مجھے بہت کئی ہندو لیڈران نے اس کی شکایت کی
کی لیکن میں نے اونکو بھی کہا کہ ایسا خیال دلیں لانا بھی گناہ ہے۔ اسکے بعد ناگپور
کانگریس کا اجلاس ہوا۔ وہاں مسلمانوں کی طرف سے سکولوں کے بائیکاٹ
کے معاملے میں یہ مطالبہ تھا کہ جو شرط مہاتما گاندہی نے نابالغ لڑکوں کو سرکاری
سکولوں سے علیحدہ ہونے کی ترغیب کے برخلاف لگائی تھی وہ اڑادی جاوے
کیونکہ مسلمانوں کا مذہب اونہیں مجبور کرتا ہے کہ دشمن اسلام کیساتھ عدم
تعاون کیلئے بچوں کو بھی ترغیب دینا ثواب ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ناگپور میں
خلافت کانفرنس کے اندر بیٹھے ہوئے میں نے مہاتما گاندہی کی توجہ قرآن مجید
کی اون آیتوں کی طرف دلائی تھی جو مسلمان علما پڑھتے تھے اور جسمیں کفار
کے قتل اور غازی گری کیلئے فرمان تھا۔ اس کے سوائے بعض مسلمان لیڈروں کی
خاص تبلیغ کے بارے میں بھی مہاتما گاندہی کو خبردار کیا تھا سنہ ۱۹۲۱ء بیتے کچھ کچھ
شبہ بعض ہندو شرفا کے دلوں میں جاگزین ہوتا جاتا تھا کہ مسلمان اپنی
مطلب برآری کے بعد ضرور رنگ لائینگے اور ہندوؤں سے علیحدہ ہو جائینگے
مجھسے دو تین بھائیوں نے ایسا شبہ ظاہر کیا لیکن میں نے اونہیں اطمینان
دلا کر یہی جواب دیا کہ شبہ پاپ ہے اس سال کے درمیانی حصہ میں ہی موپلوں کے
مظالم کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ احمد آباد کانگریس میں (دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء کے آخری ہفتہ)

موپلوں پر اظہار ناراضگی کا ریزولیوشن پیش کیا گیا اُس وقت اس ریزولیوشن کی جو مخالفت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی اوسے دیکھکر میرا ماتھا بھی ٹھنکا تھا مولانا حسرت موہانی نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ موپلوں نے کسی ہندو کو بجبر مسلمان نہیں بنایا جب اُنکا برٹش گورنمنٹ سے جنگ تھا تو وہ جگہ دیعنی مالابار) دار الحرب ہو گئی اس میں اگر ہندو موپلوں کے ساتھ نہوتے تو واجب القتل تھے اونھوں نے اوس عذاب سے بچنے کیلئے بخوشی اسلام قبول کیا مولانا حسرت موہانی کے ساتھ ہی بہت سے علماء ایسا ہی کہتے تھے آخر مہاتما گاندھی کی آواز کے نیچے دب کر وہ ریزولیوشن بھی بعد بحث نرم کئے جانیکے پاس ہو گیا مگر ایک خیال مسلمان نمایندگان کی طرف سے اور پیش ہوا وہ یہ کہ جہاں مسلمان کہدیں کہ کوئی تجویز اونکے مذہبی عقائد کے منافی ہے تو اوسے وہیں روکدیا جاوے اس پر غور ہو رہا تھا کہ میں نے کہا کیا غریب ہندؤں کا بھی پاس ہو گا کہ اگر وہ کہدیں کہ اُن کے مذہبی احساس کے برخلاف ہے تو کیا وہ تجویز اس وقت روکدی جائے گی۔ مہاتما گاندھی جی نے جواب دیا کہ تو (مفہوم) ہی ہے میں نے جواب دیا کہ تب مسلمانوں کی نسبت بھی مفہوم ہی ہے۔ اس طرح وہ خاص تجویز اس وقت نظر انداز ہو گئی

اس کے بعد بار دولی کا ریزولیوشن پاس ہوا اور کانگریس کی ساری جد و جہد بند ہو گئی۔ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دہر کر بیٹھ گئے دوسری طرف مصطفےٰ کمال پاشا کی بہادر تلوار نے ٹرکی کو آزاد ہی نہیں کرا دیا بلکہ اُن کے سارے دشمنوں کو

پسپا کر دیا مسلمانوں نے منہ مانگی مراد پائی اور اُن کی بے اعتنائی کی اس
وقت حد نہ رہی پنجاب میں میاں فضل حسین کی اتحاد کے لئے تباہ کن پالیسی کے ساتھ
عدم تعاون کی کانگریسی اور خلافتی مسلمان لیڈر بھی شامل ہو گئے۔ ملتان کے مسلمان
بدمعاشوں کی سرکوبی کی جگہ پنجابی مسلمان لیڈروں نے اُن کی پیٹھ ٹھونکی
سنگٹھن کے جرم میں نتیجہ مدن موہن مالویہ جی کو کوسنا شروع کر دیا اور
آخر کار ہندو سنگٹھن اور شدھی کو آڑ بنا کر وہ طوفان بے تمیزی برپا کیا جس کا
کوئی حد و حساب نہیں یہ معاملات بہت ہی تازہ ہیں اس لئے ان پر کچھ لکھنے کی
ضرورت نہیں ہے

ہندو مسلم اتحاد کس نے توڑا اور کس کی زیادتی ہوئی اسکے متعلق ہمیں ناظرین
کی توجہ اُس اُس بیان کی طرف دلاتا ہوں جو نیشنل کانگریس دہلی کے موقعہ
پر میں نے دیا تھا۔

کانگریسی لیڈران کی کانفرنس
میں
شدھی اور ہندو سنگٹھن

کانگریس کے جنرل سکریٹری مسٹر گوپال کرشن کا مدارس سے تار آیا کہ ۱۱ ستمبر کو
دہلی میں منعقد ہونیوالی لیڈر کانفرنس میں شریک ہوں۔ نیز مالوی جی کے نام
بھی اسی مطلب کا تار دیا گیا تھا۔ ۱۱ ستمبر کو ۳ بجے مقررہ وقت سے پہلے ہی میں مقررہ

جگہ پر پہونچ گیا مسلمان بھائیوں کی طرف سے بڑے بڑے مولوی مولانا کچھہ دیر
بعد موجود ہو گئے یوں تو تیس یا چالیس برگزیدہ لیڈران کو ہی اس کانفرنس
میں مدعو کیا گیا تھا لیکن آخیر تک ڈیڑھ سو کی بھیڑ بھاڑ ہو گئی اور ایسا ہی دوسرے
دنوں میں بھی ہوتا رہا سب سے پہلے بنارس کے مشہور فلاسفر بابو بھگوان
داس ایم۔ اے نے ایک عمدہ شانت مئی تقریر کی اور ساتھ ہی کچھہ تجاویز
بھی پیش کیں۔ لیکن اُن کی طرف حاضرین زیادہ متوجہ نہ ہوئے تب یہ قرار
پایا کہ شدھی اور سنگٹھن پر کھلم کھلا اعتراضات کرنے کا موقعہ دیا جائے۔
مسلمانوں کی طرف سے جمعیت علماء ہند کے ناظم مولانا احمد سعید نے پہلی
تقریر کی اس میں سب سے پہلے مجھپر اُنہیں الفاظ میں حملے کئے گئے۔ جن
الفاظ میں خواجہ حسن نظامی نے اپنے مشہور ٹریکٹ میں کئے ہیں۔ خواجہ صاحب
نے اپنے ٹریکٹ کے دوسرے صفحہ پر تحریر کیا ہے

"سوامی شردھانند کئی رنگ بدل چکے ہیں...... آخیر وقت میں کالی سکھوں
کی حمایت کرتے وقت جیل خانے گئے اور معلوم نہیں وہاں کیا واقعہ پیش آیا
اور کس مخفی اثر سے متاثر ہوئے کہ جیل سے باہر آتے ہی وہ روش اختیار
کرلی جو کسی اور مطلب گورنمنٹ سے ہے ہمکے پیش نظر ہے یعنی ہندو
مسلمانوں میں تفرقہ اندازی چنانچہ اُنہوں نے اعلان کیا کہ اب میں
ساری زندگی مسلمانوں کو آریہ بنانے میں صرف کرونگا اور اعلان ہی
نہیں کیا بلکہ عمل بھی شروع کردیا"

مولانا احمد سعید نے اس مضمون کو صحیح طور پر واضح کردیا اور مجھپر

کھلا چارج لگایا کہ میں نے گورنمنٹ سے روپیہ لیکر ہندو مسلمانوں کو لڑانیکا بیڑا اُٹھایا ہے یہیں تک انہوں نے بس نہیں کی بلکہ جب تھوڑی دیر کیلئے کارروائی بند ہونے کی وجہ سے میں کمرے سے باہر نکلا تو انہوں نے مجھے کہا کہ گورنمنٹ کے نام میرا خط پکڑا گیا ہے جس میں میں نے ہندو مسلمانوں کو لڑانے کا وعدہ کیا ہے اور روپیہ وصول کرنیکا اقبال کیا ہے میں نے اُن سے کہا کہ میرے اُس خط کا عکس شائع کرادو جس سے لوگوں کو اصلیت معلوم کرنیکا موقعہ ملے۔ پوشیدہ طور پر زہر پھیلانا بھلے آدمیوں کا کام نہیں ہے اسپر مولانا نے جواب دیا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں انہوں نے وہ خط نہیں دیکھا ہے" وائسرائے سے لیکر معمولی پولیس والوں اور ان افواہوں کے پھیلانیوالے کانگریسی اور غیر کانگریسی اصحاب سے میری درخواست ہے کہ اگر کوئی ایسا ثبوت اُن کے پاس ہے تو اُسکو شائع کرادیں اور اگر یہ تمام افواہیں بے بنیاد ہیں تو اُنکا اعلان کردیں۔

مولانا صاحب نے شدھی کے معاملہ میں شروعات کا الزام مجھپر عاید کیا اور ہندو سنگٹھن کو سارے فساد کی جڑ بتلایا میں نے جواب میں سوا دو گھنٹے تک کانگریسی لیڈروں اور مسلمان مولویوں کے سب اعتراضات کا جواب دیکر ثابت کیا کہ آگرہ اور اردگرد جتنا شور مچا اُسکی وجہ مسلمان مولوی تھے اور کہ ہندو سنگٹھن کا خیال موجودہ شکل میں آٹھ سال سے چل رہا ہے اور اُسکا مدعا مسلمانوں کی مخالفت کرنا نہیں ہے۔ میری تقریر کے بعد پنڈت ہرکرن ناتھ مصر یو۔ پی کے مشہور کانگریسی

لیڈر نے بحث کے اور مالوی جی سے تین سوالات کئے جو معہ جواب ذیل میں دئے جاتے ہیں

سوال۔ کیا بغیر ہندو مسلم اتحاد کے سوراجیہ حاصل ہو سکتا ہے

جواب (دونوں کا) نہیں

سوال۔ کیا شدھی اور سنگٹھن سے مسلمانوں کے اندر ہیجان پھیلا ہوا ہے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچا ہے۔

جواب۔ (مالوی جی کا) ہاں (میرا) کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے ہندو مسلم اتحاد پہلے ہی سے میاں فضل حسین اور ملتان کے مسلمانوں کے اتیاچار سے ٹوٹ چکا تھا اور کانگریس کا کام بھی باردولی کے بعد رک گیا تھا مسلمان مولویوں اور کچھ ہندو لیڈران نے شدھی اور سنگٹھن کو ایک بہانہ بنا لیا۔

سوال۔ اس بے چینی کو دور کرنے کا کیا علاج ہو سکتا ہے

جواب۔ (مالوی جی) اسکو کل بیان کرونگا

(بس پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہوئی)

۱۲ ستمبر کو ۳ بجے پھر کانفرنس شروع ہوئی اور پوجیہ مالوی جی نے اپنی پہلی تقریروں کو پڑھکر سنایا اور مثال دیتے ہوئے ثابت کیا کہ اُن کے بارے میں بہت جھوٹی افواہیں پھیلائی گئی ہیں۔ ہندو سنگٹھن کا مدعا مسلمانوں کو نقصان پہونچانا نہیں ہے بلکہ وہ اپنی حفاظت ہے جس سے کوئی بھی سمجھدار مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ مالوی جی کے بعد

کئی سجنوں نے تقریر کی جن میں سے بہار کے کانگریسی لیڈر مسٹر محمد شفیع
نے صاف الفاظ میں کہا کہ مالوی جی کی تقاریر کی رپورٹ پڑھکر اور
اب لیکچر سے اُنکو سُنکر اُن کی یہ رائے ہے کہ ان سے بڑھکر بھارت ورش
کا دوسرا دشمن نہیں۔ اسکے بعد مسلمان لیڈر ہی بولتے رہے اور جہاں
سب نے ایک آواز ہو کر منظور کیا کہ جیسا حق ہندوؤں کو مسلمان بنانیکا
مسلمانوں کو ہے ویسا ہی حق ہندوؤں کو ہے وہ غیر مذاہب والوں کو
ہندو بنا لیں۔ یہ سب باتیں کہتے رہے کہ کوئی قابل عمل تجویز سامنے
آنی چاہئے لیکن پیش کسی نے کچھ نہ کیا اور وہ "دیگراں را نصیحت خود را
فضیحت" کی کہاوت پر ہی عمل کرتے رہے آخیر میں مولانا آزاد سبحانی
نے اُس تجویز پر سب کا دھیان دلایا جو انھوں نے اور بابو پرشوتم داس
ٹنڈن نے اخبارات میں شائع کرائی تھی۔ اسپر میں نے صاحب صدر
کی اجازت لیکر بولنا شروع کیا اور تمہید یہ باندھنی چاہی کہ اگرچہ
شروعات مسلمان مولویوں کی طرف سے ہوئی ہے اور آگرے کے
نزدیک تمام شور و شر انہیں کے وہ ذمہ دار ہیں لیکن میں اپنی طرف
سے انکی تجویز کو بھارتیہ ہندو شدھی سبھا سے منوانے کی کوشش کرونگا
میں اپنے ٹریکٹ سے شدھی کے متعلق پڑھ ہی رہا تھا کہ مولانا محمد علی
نے صاحب صدر کی توجہ دلائی کہ مجھے روک دیا جائے اسپر میں خود
ہی رک گیا اور میں نے کہہ دیا کہ مولانا آزاد سبحانی اور بابو پرشوتم
داس ٹنڈن کی مندرجہ ذیل تجویز کو میں بھارتیہ ہندو شدھی سبھا

کی انتظامیہ کمیٹی میں منظوری کیلئے پیش کردونگا۔ اگر مسلمانوں کی تمام جماعتیں اپنے مبلغوں کو واپس بلائیں تو شدھی سبھا بھی اپنے پرچارکوں کو صرف آگرے سے ہٹالیگی میں نے یہ بھی کہا کہ میں تنہا یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر مسلمان بھائی اپنے تمام مبلغوں کو واپس بلانے کے لئے تیار ہو گئے اور بھارتیہ شدھی سبھا نے میری درخواست کو منظور نہ کیا تو میں شدھی سبھا کے صدر کے عہدے سے دست بردار ہو جاؤنگا۔

مولانا آزاد اور ٹنڈن جی کی تجویز حسب ذیل ہے۔

کسی بھی پارٹی کے اغراض و مقاصد کے متعلق شبہ نہ کرتے ہوئے ہم نہایت صدق دل سے ان ہندو مسلم پرچارکوں سے جو کہ اس وقت ضلع آگرہ میں تحریک شدھی کو سرگرمی سے جاری رکھنے یا اس کی مخالفت کرنے کی غرض سے ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی جد و جہد کو بند کر دیں۔ اور ملکانے کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ

جو چاہیں سو کریں۔ اگر ملکانے اپنی ہندو برادری میں شامل ہونے کے خواہش مند ہیں اور ہندو ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیئے تیار ہیں تو یہ شدھی کا کام اپنے ان کے بھائیون کے ہاتھ میں ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔

کسی مقامی آدمی کے بوقت ضرورت اس کام میں صلاح مشورہ دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس خالص سماجک کام میں مذہبی تبلیغ یا ہندو مسلم عناد کی کوئی بھی سپرٹ نہیں ہونی چاہیئے۔

میرے اس عہد کو سنکر مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی نے بڑی فراخدلی سے کہا کہ وہ بھی عہد کرتے ہیں کہ ان کے جو تجاس مبلغ آگرہ میں کام کرتے ہیں ان سب کو ہٹا لینگے اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا اور سات مسلمان اور سات ہندوؤں کی کمیٹی عملی تجاویز سوچنے

کیلئے مقرر کی گئی

۱۴ ستمبر کو اس کمیٹی کا پہلا جلسہ ۹ بجے دریاگنج کی ۱۲ کی کوٹھی میں ہوا۔ ۱۱½ بجے تک کے آپس کے خیالات کے تبادلہ کے بعد ایک یہی نتیجہ نکلا کہ سہارنپور وغیرہ جگہوں کے فسادات کی تحقیقات کرنے کے لئے سات آدمیوں کی کمیٹی مقرر ہو چکی ہے۔ دوسرا سوال زیر غور شدہی کا تھا لیکن اسی مقام پر ایک دوسری کمیٹی کا جلسہ تھا اسلئے جلسہ برخاست ہوا۔ ۴ بجے دن کے مندرجہ ذیل سوال بذریعہ ٹیلیفون پنڈت دیوریتن شرما شتری ہندو سبھا نے کیا۔

"مالوی جی نے دریافت کیا ہے کہ اگر آگرے کے ضلع سے دیوبندی مولوی واپس آجائیں مگر احمدیہ جماعت کے واسطے ہم نہیں کہہ سکتے تب آپکی کیا پوزیشن ہوگی"

میں نے اس کا جواب لکھکر ٹیلیفون والے کو دیا جو اس نے جوں کا توں بولدیا "میری پوزیشن یہ ہوگی جب تک ایک ایک مسلمان مبلغ چاہے کسی فرقہ کا ہو واپس نہ آجائیگا اور وہ سب ملکر یہ اعلان نہ کردیں گے کہ ان کا کوئی مبلغ ادھر نہیں جائیگا تب تک اپنی شدہی سبھا کو یہ صلاح دینے کا حوصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے پرچارکوں کو ضلع آگرہ سے ہٹالیں"

۱۵ ستمبر کو پھر کمیٹی کا جلسہ ہوا اسمیں جہاں بابو بھگوانداس ایم۔اے کی اپنی تجاویز پھر سے پیش ہوئیں ہاں مولانا شبیر احمد نے اپنی تجاویز بھی پیش کیں۔ بہت سے بحث مباحثہ کے بعد حکم ہوا کہ تجاویز چھپوا کر ممبران کو تقسیم کردیجائیں

اسکے بعد غور ہوگا۔ دیگر سوالات پر غور ہوتا رہا۔ مولانا کی تجاویز چھپکر آگئیں اور
اُسکے موافق ۱۷ اور ۱۸ ستمبر کو شدہی کے متعلق غور ہوتا رہا مولانا صاحب
کی تجاویز ذیل میں درج کیجاتی ہیں۔ "یہ مجلس تجویز کرتی ہی کہ بھارتیہ شدہی
سبھا جمیعت علماء ہند اور اُن دوسری تمام انجمنوں سے جو اسوقت ملکانہ
راجپوتوں میں شدہی اور اُسکی مدافعت کا کام سرانجام دے رہی ہیں آل انڈیا
کانگریس کمیٹی کی طرف سے پُرزور درخواست کرے کہ وہ ملک میں پُر آشوب
حالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی اُن تمام جارحانہ اور مدافعانہ کارروائیوں کو
جو ایک باقاعدہ معرکہ آرائی کی صورت میں ظاہر ہوکر مسلمان اور ہندو قوم
کے جذبات عداوت و منافرت کے بھڑکانے اور مسئلہ آزادی ہند کو تاریک
بنانیکا موجب ہورہے ہیں عام ملک کے مفاد کی خاطر فوراً موقوف کردیا اور
ملک کی سیاسی فضا کو جو بدقسمتی سے روز بروز مکدر ہوتی چلی جارہی ہے صاف کرنے
اور پُرامن بنانیکیلیے اُن متقابل مبلغین کو جو ایک طرح کی مذہبی جنگ میں منہمک
ہیں حسب تربیت ہجوم و وقائع واپس بلالیں، باقی نصف مذہبی تبلیغ جو بین الاقوامی
رواداری کیساتھ معقول اور ملائم طرز پر ہو اُس میں کوئی جماعت دوسری
جماعت کو روکنے کا اختیار نہیں رکھتی اور اُسکے لئے خاص برادری یا خاص
رتبہ کی کچھ تقسیم نہیں ہے"۔ مولانا صاحب کی اس تجویز کا مطلب یہ تھا کہ ہندو
حملہ آور ہیں اور مسلمان حفاظت کرنیوالے ہیں اسلئے اُسی ترتیب سے اُنکے مبلغ لوٹنے
چاہئیں میرا دعویٰ تھا اور اب بھی ہی کہ پہلے میدان میں مبلغ مسلمان گئے اور اُسکی
وجہ سے ہندوؤں کو ایک جماعت بنانی پڑی اسلئے پہلے مسلمانوں کو لوٹنا چاہیے۔

مولانا محمد علی اور دیگر مسلمان لیڈران نے یہ تجویز کی کہ آگے پیچھے کے خیال کو چھوڑ کر دونوں طرف کے مبلغ ایک ہی وقت ایک ہی لحظہ آگرہ سے چلدیں لیکن مسلمان علماء نے نہیں مانا مولانا محمد علی نے ٹوپی اُتار کر علماء سے مان جانیکیلئے کہا لیکن علماء اپنے خیال پر قائم رہے اس سوال پر غور بہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن کمیٹی نے یہ رپورٹ کی کہ ابھی تک اس بارے میں ہم کچھہ نہیں کر سکتے ہندو و مسلمانوں کی جماعتوں کی نمائندوں کو جمع کر کے پھر غور کرینگے۔ دونوں طرف سے ممبران انکی الفاظ میں کہہ رہے تھے کہ کسی طرح اس سوال کو اس وقت ٹالدیا جائے مجھسے کانگریس کے کئی ہندو و مسلمان لیڈران نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کیلئے جو یہ کوشش کیجا رہی ہے اس کو شاید ہونیوالے ہندو مسلم مباحثہ سے صدمہ پہونچے اسلئے اُسے بند کر دینا چاہئے یہی وجہ ہے کہ میں نے جس بڑے پیمانے کے مناظرے کا اشتہار دیا تھا اُسے بند کر دیا میں نے لیڈران کی کانفرنس کی ساری کہانی جسکا شدھی اور سنگٹھن کے متعلق مجھسے تعلق تھا بیان کر دی۔

مسلم اخبارات میں کیا شائع ہوا ہے اس سے مجھے کچھہ مطلب نہیں ہے کچھہ ہندو اخبارات نے جان بوجھکر اور دوسروں نے انکے دھوکے میں آکر میرے متعلق بہت سی افواہیں پھیلا دی ہیں جس سے شدھی سبھا اور سنگٹھن کو بھی قدرے نقصان پہونچا ہے میں نے جو انگریزی کا ٹریکٹ تقسیم کیا تھا اسمیں لکھا تھا کہ تندرستی کی خرابی اور اپنے پہلے کاموں کو نظر رکھکر میں اب ادہر کا کام نہ کر سکونگا اُسکا مطلب یہ سمجھا گیا کہ میں شدھی کے کام سے الگ ہو گیا میرا خیال یہ تھا کہ اپنے گورو رشی دیانند کی جنم شتابدی کے موقعہ تک جو شاید سمبت ۱۹۸۱ کے پوس مہینے کے آخیر میں ہو گی اپنی بھینٹ کتابی شکل میں تیار کر کے اُنکے چرنوں میں رکھدوں اسکے لئے میں ڈیڑہ برس تک اُدہر کام کرنا چاہتا تھا لیکن بہت سے سناتن دہرمی اور آریہ سماجی لیڈران کے بضد ہونے پر میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ شدھی کا کام زیادہ زور کیساتھ کرتا رہوں اور ساتھ ساتھ رشی کے قرض سے بھی سبکدوش ہوں۔ اگر ایکسال میں نہیں تو کئی سال میں وہ کام ختم ہو جائیگا۔ اگر آریہ جاتی کے شبھ چنتک یہ خیال کریں کہ میری کمزوری سے شدھی کے کام کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے تو انکا فرض ہے کہ خود میدان عمل میں آ اترآئیں اور زیادہ مضبوط کندھے پر اس بوجھ کو رکھدیں۔

قومی جنگ

۳۰ جنوری سے لیجسلیٹو اسمبلی میں شروع ہو گئی، ملک کے بڑے بڑے لیڈران بھارت ورش کے سچے سپوت ہندوستان کے گھر گھر کونے سے اس جنگ میں نبرد آزما ہیں، جنگ کا پہلا مورچہ مہاتما گاندھی کی رہائی اور حصول سوراجیہ کی شکل میں فتح ہو چکا ہے، مگر یہ جنگ ابھی عرصہ تک دہلی میں جاری رہیگی، ہم نے اس جنگ کی مکمل خبریں اُسی دن شائع کرنیکا انتظام کیا ہے، اگر آپ گھر بیٹھے اس قومی جنگ کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں اور اسمبلی کی خبریں سب سے پہلے سننے کے شائق ہیں تو بہت جلد

روزانہ اخبار تیج دہلی کے

گراہک بنئے "تیج" دہلی کا مشہور قوم پرست ہندو اخبار ہے۔ جو قریب ایک سال سے زیر سرپرستی شری سوامی شردھانند جی مہاراج نکل رہا ہے، اس قلیل عرصہ میں ہندو جاتی کے سچے سیوک دیش ہتیشی دلتوں کے اُدھارک پراچین آریہ سبھیتا کے سرفروش رکھشک شدھی اور سنگٹھن کے زبردست حامی اور سوراجیہ کے خواہشمند نے ملک و قوم و ہندو جاتی کی جو اعلیٰ خدمات سرانجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پانی پت۔ اجمیر۔ میرٹھ۔ سہارنپور۔ بسلیپور وغیرہ کے دردناک واقعات کا انکشاف اس نے سب سے پہلے کیا۔ اپنی بیدھڑک صاف گوئی وہ ہندوؤں کے جائز حقوق کی پاسداری کے لئے جو جو مخالفتیں اور مصیبتیں اُسے برداشت کرنی پڑیں وہ بھی روز روشن کی طرح عیاں ہیں، اندریں حالات یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ "تیج" کا گراہک بننا ہندو ماتر کا پرم کرتویہ ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ "تیج" از سر نو ہندو جاتی کے فدائی مشہور اہل قلم لالہ دیش بندھو گپتا نے جو حال ہی میں ہندو دھرم اور جاتی کے جائز حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے کئی مہینے کی جیل کاٹ کر آئے ہیں سنبھال لی ہے، اور "تیج" میں نئی روح پھونک دی ہے "تیج" نہ صرف بلحاظ ملکی و غیر ملکی خبروں کو سب سے پہلے شائع کرنے کے دوسرے اخبارات پر فوقیت رکھتا ہے۔ بلکہ بلحاظ اعلیٰ مضامین کے بھی جو وقتاً فوقتاً تیج کے کالموں میں شائع ہوتے رہتے ہیں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ ہر ایک ہندو کو بلاتامل تیج کا گراہک بننا چاہئیے۔

نوٹ ہر شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے، کمیشن معقول دیجاتی ہے۔

قیمت سالانہ عـہ ششماہی لعہ سہ ماہی صہ ماہواری عہ

منیجر تیج دہلی

